ارشادِ اقبال

خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء

مکتبہ سیاسیہ اردو بازار دہلی

FIROZE

1 6 AUG 1971

خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء

از

علامہ اقبال

دور حاضرہ کے اہم ترین مسائل پر حکیم الامت کا
بصیرت افروز تبصرہ اور ہندوستان کیلئے پاکستان
کی تجویز

مکتبہ سیاسیہ - اردو بازار دہلی

قیمت ۶ر

خواجہ برقی پریس دہلی

IQBAL ACADEMY KARACHI

خطبۂ صدارت

سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ سنہ ۱۹۳۰ء منعقدہ الٰہ آباد

حضرات میں آپ کا بے انتہا شکر گذار ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں جو مسلمانانِ ہند کے سیاسی خیالات و اعمال کی تاریخ میں نہایت نازک ہے۔ مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عظیم الشان اجتماع میں بعض ایسے حضرات موجود ہیں جن کا موجودہ سیاسی تجربہ میری نسبت بہت زیادہ وسیع ہے اور امور مہمہ کے متعلق جنکی معلومات کی میرے دل میں بے انتہا وقعت ہے اس لئے اگر میں اُن سیاسی امور میں جنکے تصفیہ کے لئے یہ حضرات آج اِس جگہ جمع ہوئے ہیں انکی رہنمائی کا دعویٰ کروں تو یہ دعویٰ بالکل بیجا ہوگا میں کسی جماعت کا لیڈر نہیں۔ اور کسی لیڈر کا پیرو نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور اسکی شریعت اسکی سیاستِ مُدن۔ اسکی ثقافت (کلچر) اسکی تاریخ اور اسکے ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس رُوحِ اسلامی کے ساتھ

ایسی فراست عطا کر دی ہے جس کی روشنی میں میں اس عظیم الشان اہمیت کا اندازہ کر سکتا ہوں جو اسلام کو ایک عالمگیر حقیقتِ ثابتہ کی حیثیت سے حاصل ہے۔ چونکہ اس امر کے فرض کر لینے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ مسلمانانِ ہند اس روحِ اسلامی سے عہدِ وفا باندھ چکے ہیں اس لئے میرا منشا یہ نہیں کہ میں آپ کے فیصلوں میں آپ کی رہنمائی کی جرأت کروں، بلکہ مقصد صرف اتنا ہے کہ اس فراست کی روشنی میں جو مجھے حاصل ہے آپ کو اس اصلِ اساسی کا صحیح اور واضح احساس کرا دوں جو ان فیصلوں کی عمومی تشکیل کر سکے۔

اسلام اور قومیت *Nationalism*

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام جو ایک اخلاقی نصب العین اور ایک خاص قسم کی سیاست مدن کا مجموعہ ہے (اس سے میری مراد ایک ایسے معاشرتی نظام سے ہے جو ایک خاص ضابطۂ قوانین کے ماتحت ہو، اور جس میں ایک مخصوص اخلاقی تخیّل کی روح کارفرما ہو)۔ مسلمانانِ ہند کی تاریخ حیات میں سب سے بڑا جزو ترکیبی رہا ہے۔ اسی نے وہ اساسی جذبات اور باہمی کشش کے سامان مہیا کئے ہیں جو منتشر افراد اور مختلف گروہوں کو بتدریج متحد کر کے بالآخر انہیں ایک متمیز اور معیّن قوم کی صورت میں منظم کر دیتے ہیں۔ جو اپنا مخصوص اخلاقی شعور رکھتی ہے۔ درحقیقت یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان ہی وہ ملک ہے جس میں اسلام کا وہ شعبہ جو قوموں کی تعمیر سے متعلق ہے اپنی پوری آب و تاب سے کارفرما [illegible]

سوسائٹی کی جو صورت اختیار کی ہے وہ صرف اس امر کی رہین منت ہے کہ اسلام ایک ایسے کلچر کی حیثیت سے عمل پیرا ہوا ہے جس کا محرک ایک مخصوص اخلاقی تخیل ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی نے اپنی نمایاں ہم آہنگی اور قابل یک جہتی کے ساتھ جو موجودہ شکل اختیار کی ہے وہ اُن آئین و قوانین کے قالب میں ڈھل کر تیار ہوئی ہے۔ جن کا اسلامی کلچر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لیکن وہ خیالات جو مفکرین یورپ نے دنیائے ریاست میں پھیلا دئے ہیں وہ ہندی وغیر ہندی مسلمانوں کی موجودہ نسل کے مطمح نگاہ کو نہایت تیزی کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں، ہمارے نوجوان اِن خیالات سے متاثر ہو کر اس امر کے لئے مضطرب ہو رہے ہیں کہ اپنے اپنے ملکوں میں ان خیالات کو عمل میں لے آئیں۔ وہ اِن حقائق پر کبھی تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتے جو یورپ میں اِن خیالات کے ارتقار کا باعث ہوئے ہیں۔ یورپ میں مسیحیت صرف تارک الدنیا اشخاص کا ایک نظام سمجھا جاتا تھا جس نے رفتہ رفتہ ایک وسیع نظام کلیسائی کی صورت اختیار کر لی۔ لوتھر نے جو صدائے احتجاج بلند کی تھی وہ اس کلیسائی نظام کے خلاف تھی نہ کہ دنیائے معاملات کے کسی نظام مدنیت کے خلاف۔ اس لئے کہ عیسائیت کو تو کسی ایسے سیاسی نظام سے تعلق ہی نہیں، بلاشبہ لوتھر اس نظام کے خلاف بغاوت کرنے میں بالکل حق بجانب تھا۔ مگر میرے نزدیک اس نے اس امر کا احساس نہ کیا تھا کہ یورپ کے مخصوص حالات میں اس بغاوت کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ حضرت مسیح ع کا عالمگیر نظام اخلاق کاملاً تہ و بالا ہو جائے گا۔ اور بے شمار قومی اور محدود نظام ہائے اخلاق اس کی جگہ لے لیں گے۔ رُوسو اور لوتھر جیسے آدمیوں

ہو گئی، جس کے مختلف اجزاء میں کوئی باہمی ہم آہنگی نہ تھی اور انسانیت کا ایک ہمہ گیر تصور قومیت کے تنگ دائرہ میں گھر کے رہ گیا۔ قومیت کا یہ تصور کسی محسوس بنیاد مثلاً عقیدہ وطنیت پر ہی قائم ہو سکتا تھا اور اس کا اظہار ایسے مختلف نظام ہائے سیاست کے ذریعے سے ہی ممکن تھا جو قومی خطوط پر نشو و ارتقاء حاصل کر سکتے ہوں وہ خطوط جو صرف اس اصول کو ہی تسلیم کریں کہ سیاسی اتحاد کی بنیاد جغرافیائی حدود پر ہی قائم ہو سکتی ہے۔ اگر مذہب کے متعلق عقیدہ ہی یہ ٹھہرے کہ اس کا تعلق کاملاً اگلے جہاں سے ہے تو مسیحیت کا جو حشر یورپ میں ہوا وہ بالکل لازمی تھا، حضرت مسیحؑ کے عالمگیر اصول اخلاق کی جگہ قومیت کے نظریۂ اخلاق و سیاست نے لے لی۔ اس تخریب و تعمیر اور ردّ و بدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ یہ سمجھ بیٹھا کہ مذہب ہر فرد کا نجی معاملہ ہے۔ اور انسان کی دنیاوی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام وحدت انسانی کو روح اور مادہ کے دو الگ تھلگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ، مذہب اور سیاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے۔ اس کے نزدیک انسان کسی ایسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جسے کسی ایسی مقدس دنیا کے حصول کی خاطر تیاگ دینا پڑے جو اس دنیا سے الگ کہیں اور واقع ہو۔ اسلام کے نزدیک مادہ، روح کی اس صورت کا نام ہے جو زمان و مکان کے لباس مجاز میں جلوہ فرما ہے۔ یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح و مادہ کی ثنویت (*Duality*) کا خیال اخذ کیا۔ اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ آج یورپ کے بہترین مفکر تو اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر چکے ہیں۔ لیکن اس کے سیاسی مدبر غیر محسوس طور پر دنیا کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اندھا دھند اس غلطی کو ایک مذہبی عقیدے کی حیثیت

سے قبول کرے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ روح اور مادہ کی یہی وہ غلط تفریق ہے جو یورپ کے مذہبی و سیاسی افکار پر اس نہج سے اثر انداز ہوئی ہے کہ اس نے یورپ کے نظام حکومت سے مسیحیت کو قریب قریب بالکل خارج کر دیا ہے جس کی وجہ سے یورپ ایسی بے جوڑ سلطنتوں کا مجموعہ بنکے رہ گیا، جنکے سر میں انسانیت کا سودا نہیں۔ بلکہ اس پر قومیت کا بھوت سوار ہے۔ اب جو قومی سلطنتیں عیسائیت کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات کو پامال کرنے کے بعد اب ایک متحدہ یورپ کی ضرورت کا احساس کر رہی ہیں۔ یعنی پھر اسی وحدت کا احساس کر رہی ہیں۔ یعنی پھر اسی وحدت کا احساس جسے مسیحی کلیسا کے نظام نے ابتداء میں ان کو دیا تھا۔ لیکن انہوں نے بجائے اسکے کہ حضرت مسیحؑ کے عالمگیر اخوتِ انسانی کے تصور کی روشنی میں اسکی تشکیل کرتے لوتھر کی تعلیم سے متاثر ہو کر تباہ و برباد کر ڈالا۔ دنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا تصور ہی ممکن نہیں۔ کیونکہ اسلام میں یورپ کے ازمنہ متوسط جیسا کوئی کلیسائی نظام ہی موجود نہیں جسے اپنے کسی تباہ کرنے والے کو بلا رہا ہو۔ دنیائے اسلام میں ہمارے پاس ایک عالمگیر نظام سیاست موجود ہے۔ بنیادی اصولوں کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ان کا سرچشمہ علم الٰہی ہے۔ ان بنیادوں پر جو عمارت قائم ہے، وہ البتہ ضروریاتِ زمانہ کے اقتضاء کے مطابق ایک نئی روح کی محتاج ہے اور اس احتیاج کی وجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے فقہا (واضعین قوانین) دنیائے جدید کے داعیات سے متمسک نہیں ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دنیائے اسلام میں قومیت کے اس تصور کا انجام کیا ہوگا یہ پیشین گوئی کرنا مشکل ہے کہ آیا اسلام اس کو اپنے اندر جذب کرکے اس کی ترکیب کو بدل دے گا، جیسا کہ یہ اس سے قبل بہت سے مختلف النوع خیالات کو اپنے اندر جذب کرکے ان کی نوعیت کو بدل چکا ہے یا خود اسلام اس نظریہ کی قوت سے متاثر ہو کر اپنے نظام کو کیسے تبدیل کرے گا

حال ہی میں مجھے لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ) کے پروفیسر وَین سِنک (Wen Sinck) نے لکھا تھا کہ:۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اس وقت اسی نازک دور میں داخل ہو رہا ہے جو مسیحیت پر ایک صدی سے بھی زیادہ مدّت سے طاری ہے سب سے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کونسا طریق عمل اختیار کیا جائے جس سے قدیم دقیانوسی غلط تصورات کی عمارت تو منہدم ہو جائے۔ لیکن مذہب کی بنیادیں محفوظ رہیں۔ میرے لئے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ میں بتا سکوں کہ اس بحران میں مسیحیت کا انجام کیا ہوگا، چہ جائیکہ میں یہ کہہ سکوں کہ اسلام پر اس کا کیا اثر ہوگا۔"

اور موجودہ دور میں تو ہو یہ رہا ہے کہ "قومیت" کا تصور مسلمانوں کے مطمح نگاہ میں نسل پرستی کا جذبہ ابھار رہا ہے۔ جو ان مساعی حسنہ کو غارت کر رہا ہے جنہیں شرفِ انسانیت کی خاطر اسلام نے سرانجام دیا تھا۔ اور نسل پرستی کے اس شعور کا مطلب یہ ہے کہ نظام حیات کے متعلق ایسے نظرئے اور معیار قائم ہو جائیں جو نہ صرف اسلامی نظریاتِ زندگی سے مختلف ہوں بلکہ ان سے متصادم ہو جائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات مجھے اس بظاہر علمی بحث Academic discussion سے معذور سمجھیں گے۔ آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے، اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت

اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذن بال کشائی دے گا جس کا عقیدہ ہی کہ مذہب، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت کا حامل ہے اور جس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیر الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز خیال نہ فرمایئے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ خالص نظری مسئلہ ہے۔ نہیں، یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفس اسلام پر بحیثیت ایک نظام حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں، ہماری تاریخ میں اسلام پر کبھی ابتلا و آزمائش کا ایسا زمانہ نہیں آیا جیسا آج کل اسے درپیش ہے۔ (اس میں شک نہیں کہ) ہر ایک قوم اس باب میں مختار ہے کہ اپنے اپنے معاشرتی نظام کے اصول اساسی میں ترمیم، تاویل یا تنسیخ کرلے۔ لیکن ایک تازہ تجربہ کرنے سے پہلے اس کے لئے قطعاً ضروری ہے کہ اپنے اس تجربہ کے نتائج و عواقب پر واضح انداز سے غور و خوض کرلے۔ اس اہم مسئلہ کو جس پہلو سے میں دیکھ رہا ہوں۔ اس سے کسی شخص کو یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ میں ان حضرات سے جو مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں، آمادۂ پیکار ہوں۔ یہ مسلمانوں کا اجتماع ہے اور میرا یقین ہے کہ اس کے افراد اسلام کی روح اور اس کے نصب العین سے قلبی تعلق کو جزو ایمان

سے ظاہر ہوتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کیفیات و واردات اس نوعیت کے نہیں ہوتے کہ وہ محض شخصِ متعلقہ کے قلب میں پیدا ہو کر صرف اسی پر اثر انداز ہوں اور اس کا معاشرتی ماحول ان سے کچھ بھی متاثر نہ ہو۔ یہ ایسی کیفیات ہیں کہ ان کا مہبط تو قلب انسانی ہو۔ لیکن ان سے ایک پورا معاشرتی نظام وجود میں آجائے۔ ان کیفیات کا فوری ماحصل یہ ہوتا ہے کہ ان سے ایک خاص نظام تمدن کے اصول اساسی مرتب ہو جاتے ہیں جو آئینی تصورات (قوانین وضوابط) کا ایک جہان خاموش اپنے آغوش میں لئے ہوتے ہیں۔ اور جن کی تہذیبی اہمیت محض اس لئے کم نہیں ہو سکتی کہ ان کا ماخذ وحی الٰہی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں مذہب اور اس کے پیدا کردہ معاشرتی نظام میں کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ اگر ایک کو رد کر دیا جائے تو دوسرا خود بخود رد ہو جاتا ہے۔ بنا بریں قومیت کے خطوط پر کسی ایسے نظام تمدن کی تعمیر جو وحدتِ اسلامی کے اصول سے متصادم ہوتا ہو۔ مسلمان کے توہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی یہ وہ مسئلہ ہے جو اس وقت براہ راست مسلمانانِ ہند کے درپیش ہے۔ رینان لکھتا ہے کہ انسان کو نہ تو اس کی نسل اور مذہب کا غلام بنایا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی دریاؤں پہاڑوں کی حدود و بندیاں اسے مقید کر سکتی ہیں۔ بلکہ صحیح الدماغ اور گرم جوش دل رکھنے والے انسانوں کی عظیم الشان اجتماعیت ایک اخلاقی شعور پیدا کر دیتی ہے۔ جسے "قوم کہتے ہیں"۔ اس قسم کی جماعتی ترکیب ناممکن نہیں۔ اگرچہ اس کے لئے ایک طول طویل اور زہرہ گداز مرحلہ طے کرنا پڑے گا جس میں یوں کہیئے کہ انسانوں کو نئے قالب میں ڈھالنا اور انہیں تازہ جذبات سے مسلح کرنا ہوگا۔ اگر ہندوستان میں اکبر کی تعلیم اور شہنشاہ اکبر کا دین الٰہی عوام کی ذہنیت پر غالب آجاتا تو اس قسم

کی قومیت اس ملک میں بھی قائم ہوجاتی۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف ذاتوں اور اس کے مختلف مذہبی گروہوں میں یہ رجحان کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اپنی اپنی انفرادی جزئیات کو ایک عظیم الشان "کل" میں فنا کردیں۔ (اور یوں قطرات سمندر میں مل کر سمندر بن جائیں) ہرگز وہ اپنی جماعتی ہستی قائم رکھنے کے لئے بیتاب ہے۔ اس قسم کے اخلاقی شعور کا پیدا ہونا جو رینان کے نظریۂ قومیت کا اصل اصول ہے اتنی بڑی قیمت کا مطالبہ کرتا ہے کہ اقوام ہند اسے ادا کرنے کے لئے بالکل آمادہ نہیں ہیں لہذا ہندوستان میں اتحاد قومی یہاں کی مختلف اقوام کے جداگانہ وجود کے انکار میں نہیں بلکہ ان سب کے تعاون اور ہم آہنگی میں تلاش کرنا چاہیئے۔ صحیح تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ حقایق خواہ کتنے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں۔ ان سے چشم پوشی نہ کیجائے حصول مقصد کا عملی طریق یہ نہیں۔ کہ جس صورت حالات کا وجود ہی نہ ہو اسے خواہ مخواہ موجود فرض کرلیا جائے۔ بلکہ یہ کہ حقائق جس انداز میں ہیں ان کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے حتی الوسع بہترین استفادہ کیا جائے ہندوستان اور ایشیا کی تقدیر حقیقتاً اسی بات پر منحصر ہے کہ ہندوستان میں اتحاد قومی کو ان ہی راستوں سے تلاش کیا جائے کہ ہندوستان بجائے خویش ایک چھوٹا سا "ایشیا" ہے اسکے باشندوں کے ایک حصہ کا کلچر اقوام مشرق کے کلچر سے ہم آہنگ ہے۔ اور دوسرے حصہ کا کلچر وسطی اور مغربی ایشیا کی اقوام کے کلچر کے ساتھ اگر ہندوستان میں باہمی اشتراک عمل کا کوئی موثر اصول دریافت کرلیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قدیم سرزمین میں جو اپنے باشندوں کی کسی فطری نا قابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ

واتبلاء کی آماجگاہ رہی ہے۔ امن وامان اور مصالحت باہمی کی خوشگوار ہوائیں چلنے لگیں گی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایشیا بھر کی تمام سیاسی گتھیاں بھی سلجھ جائیں گی۔

قومیّت اور حبُّ الوطنی کا چولہ

لیکن اس تلخ حقیقت کے بیان کرنے سے صدمہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی اندرونی یکجہتی کے لئے اس قسم کے اصول دریافت کرنے میں جتنی کوششیں کیں وہ اب تک بالکل ناکام رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کوششیں کیوں ناکام رہی ہیں؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرے کی نیتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور دل میں یہ آرزوئیں چھپی ہوئی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فریق مقابل پر تغلب وتسلط حاصل کر لیا جائے۔ یا اس کی یہ وجہ ہے کہ باہمی اشتراکِ عمل کے بلند مقاصد پیش نظر ہوتے ہوں لیکن وہ استمراری اجارہ داری ہاتھ سے نہ جانے پائے جو اتفاقات زمانہ سے ایک فریق کے قبضہ میں آچکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ دماغ میں اَنَا الْمَوْجُوْدُ لَاغَیْرِیْ کا سودا سما رہا ہے۔ لیکن ان جذبات کو قومیت پرستی کے مقدس چولے میں چھپایا جاتا ہے بلند آہنگ دعاوی کو دیکھو تو حب الوطنی کی وسعت قلبی کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لو تو وہاں "ذات" اور "قبیلہ" کی وہی پرانی تنگ نظری جلوہ فرما ہے۔ ہاں! اور اس کا یہ بھی باعث ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ہر ایک جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تمدنی روایات کے

مطابق آزادانہ طور پر اپنی اجتماعی نشو و نما کر سکے۔ بہر حال ہماری ناکامی کے وجوہ کچھ بھی ہوں میں اب تک مایوس نہیں ہوں۔ واقعات کی رفتار ایک اندرونی یکجہتی کے میلان کا پتہ دیتی ہے اگر اس اصول کو ایک مستقل فرقہ وارانہ تصفیہ کا سنگ بنیاد تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں کو اپنے اس وطن عزیز میں اس امر کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ کہ وہ اپنے کلچر اور روایات کی بنا پر اپنی نشو و نما کر سکتے ہیں تو جہاں تک میں نے مسلم ذہنیت کا مطالعہ کیا ہے میں بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اس اصول کے تسلیم کر لینے کے بعد مسلمان ہندوستان کی آزادی کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر بالکل آمادہ ہوگا۔ واضح رہے کہ یہ اصول کہ ہر جماعت کو اپنی اپنی مخصوص بنیادوں پر آزادانہ نشو و ارتقا کا حق حاصل ہونا چاہیئے کسی تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے جذبہ پر مبنی نہیں ہے فرقہ پرستی بھی کئی قسم کی ہے اور اسکے اقسام میں بین فرق پایا جاتا ہے۔ جو قوم دوسری قوموں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات کی پرورش کرتی ہے وہ نہایت پست فطرت اور رذیل قوم ہے۔ میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم و شعائر۔ قوانین و ضوابط مذہبی و معاشرتی ادارات کا بیحد احترام ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیئے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق تو مجھ پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کے معابد کی حفاظت بھی کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس ملت سے عشق ہے جو میری زندگی کی طبعی افتاد کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے مذہب اپنے لٹریچر اپنی حکمت اور اپنے کلچر کی تجلیات سے اقبال کو اقبال بنا دیا ہے۔ اور

میں میرے حال میں سمو دیا ہے۔ ملت پرستی کے اس بلند ترین پہلو کی قدر و قیمت کو تو نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ علیحدگی سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"یہ کہنا کہ فرقہ وار صوبوں کا وجود میں لانا قومیت پرستی کے وسیع نظریہ کے منافی ہوگا۔ ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ دنیا میں الگ الگ فرقوں کی ہستی بین الاقوامیت کے وسیع ترین تصور کے منافی ہے۔ ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن بین الاقوامی نصب العین کا سرگرم سے سرگرم حامی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ بین الاقوامی نظام حکومت اس وقت تک ناممکن بلکہ محال ہے جب تک ہر قوم مکمل طور پر خود مختار نہ ہو، اسی طرح جب تک مختلف فرقے اس باب میں بالکل آزاد نہ ہوں کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن (کلچر) کی بنیادوں پر اپنے نظام زندگی کی تشکیل کر سکیں۔ ایک ہم آہنگ قوم کا وجود عمل میں نہیں آسکتا اور یہ کسے یاد نہیں کہ جب فرقہ پرستی کسی بہتر جذبہ پر مبنی ہو تو وہی کلچر بن جاتی ہے۔"

ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان

اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ "کل" کی تشکیل کے لئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے۔ برعکس یورپین

ایک ایسا براعظم ہے جس میں مختلف النسل، مختلف اللسان اور مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں۔ ان کے نظریۂ زندگی کی بنا کسی مشترک قومی شعور پر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو ہندوستان میں یورپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کو معرض وجود میں لایا جائے۔

دہلی میں آل انڈیا پارٹیز مسلم کانفرنس نے جو ریزولیوشن پاس کیا ہے۔ میرے نزدیک تو اس کا محرک یہی مقدس جذبہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبۂ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے انہیں اس امر میں خود مختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں اپنے مخصوص نظریاتِ زندگی کے ماتحت اپنے جوہرِ مضمر کی نشو و نما کر سکیں۔ اور پھر ان صحیح عناصر کے مجموعہ سے ایک ہم آہنگ "کل" تخلیق ہو۔ اور مجھے یقین واثق ہے کہ لیگ کا یہ اجلاس مسلمانوں کے ان مطالبات کی پرزور تائید کرے گا، جو مذکورہ قرارداد میں بیان کئے گئے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں، میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے (ہندوستان کو) حکومتِ خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر۔ کچھ بھی ہو، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان

میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم ازکم اس علاقے کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ لیکن اس نے اسکو اس بناء پر رد کر دیا کہ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو اس سے ایک ایسی ریاست معرضِ وجود میں آ جائے گی جس کا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے کمیٹی کی رائے صحیح ہے لیکن بلحاظ آبادی مجوزہ ریاست ہندوستان کے بعض موجودہ صوبوں میں سے بھی چھوٹی ہوگی۔ اگر قسمتِ انبالہ اور چند ایسے اضلاع کو جن میں غیر مسلم آبادی کی اکثریت ہے اس ریاست سے خارج کر دیا جائے تو یہ رقبہ میں کم ہو جائیگی۔ اور اس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بڑھ جائیگا۔ جب اس طرح غیر مسلم آبادی کا تناسب بہت کم رہ جائے گا تو یہ متحدہ اسلامی ریاست اس قابل ہو جائے گی۔ کہ وہ اپنے علاقے کے اندر رہنے والی اقلیتوں کو مؤثر تحفظات دے سکے۔ اس تجویز سے نہ تو ہندوؤں کو بدکنا چاہیئے اور نہ ہی انگریز کو پریشان ہونیکی ضرورت ہے۔

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم رہے۔ (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخرالامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔ اس سے مسلمانوں میں ذمہ داری کا احساس اور ان کا جذبہ

حب وطن اور بھی زیادہ ہو جائے گا۔ جب اس طرح شمال مغرب کے مسلمانوں کو ہندوستان کے سیاسی نظام میں رہتے ہوئے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہوں گے تو وہ ہر بیرونی حملے کے مقابلے پر، خواہ وہ خیالات کا سیلاب ہو یا شمشیر و سنان کا ہجوم ہندوستان کی بہترین مدافعت کر سکیں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فیصدی ہے لیکن ہندوستانی فوج کا چون فیصدی حصہ انہیں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر وہ انہیں ہزارہ گورکھے علیحدہ کر دیے جائیں جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کیے جاتے ہیں تو پنجاب کے فوجی سپاہیوں کی تعداد ساری ہندوستانی فوج میں باسٹھ فیصدی ہو جاتی ہے۔ اس میں ابھی وہ چند ہزار سپاہی شامل نہیں ہیں، جو صوبہ سرحد اور بلوچستان سے ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ اس سے آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستی کے محفوظ رکھنے کے لئے شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں میں کس قدر صلاحیت موجود ہے۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد کے قریب آزاد اسلامی ریاستوں کا مطالبہ اس غرض سے کر رہے ہیں کہ بوقت ضرورت حکومت ہند پر دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ ان کے ہاتھ آجائے۔ میں مسٹر شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کر رہے ہیں۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشوونما کا موقع ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدت قومی کے نظام حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں۔ اور جس کا مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل

طور پر انہیں کا غلبہ اور تسلط ہو۔ ہندوؤں کو یہ خطرہ بھی لاحق نہ ہونا چاہیئے کہ آزاد مسلمان ریاستوں کے قیام سے مقصد یہ ہوگا کہ ان میں ایک قسم کے مذہبی نظام حکومت کی ترویج ہوگی۔ میں آپ کی خدمت میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے متعلق جب "مذہب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مفہوم کیا ہوتا ہے؟

اسلام ایک نظامِ حکومت ہے

حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک رُوحانی واسطہ کا ہی نام نہیں ہے۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کرے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا۔ جبکہ دنیا میں کسی رُوسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے۔ جس کی رُو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پاکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا۔ اور کبھی اس سے، بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے۔ جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے، جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ پر فٹ ہو، وہ اس مشینری کا ایک فعال پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اسپر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اسلامی نظامِ حکومت کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے "ٹائمز آف انڈیا" کا وہ مقالۂ افتتاحیہ پڑھنا چاہیئے جو جریدۂ مذکور نے آج سے کچھ عرصہ پیشتر انڈین بینکنگ انکوائری کمیٹی

کے متعلق لکھا تھا۔ "ٹائمز" لکھتا ہے۔

"قدیم ہندوستان میں حکومت کی طرف سے شرح سود متعین کرنے کے متعلق قوانین وضع ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب اس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس شرح سود پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی گئی، باوجودیکہ اسلام میں رقوم قرضہ پر سود لینا صاف طور پر ممنوع[1] قرار دیا گیا ہے۔"

لہذا ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کے متعلق میرا یہ مطالبہ ہندو ہندستان اور مسلمانان ہند دونوں کے بہترین مفاد پر مبنی ہے، اس سے چونکہ اندرونی طاقتوں میں توازن پیدا ہو جائیگا۔ اس لئے ملک میں امن و امان قائم ہو جائیگا۔ یہ تو ہندوستان کا فائدہ ہوگا۔ اور اسلام کو موقع ملے گا کہ اسپر عربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آچکے ہیں۔ ان سے مخلصی حاصل کرے۔ اور اپنے شرعی قوانین اپنی تعلیم اور اپنے کلچر کی تنظیم کرکے انہیں اپنی اصلی روح اور عصر حاضر کی ضروریات سے قریب تر لاسکے۔

فیڈرل ریاستیں

اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی۔ کہ چونکہ ہندوستان میں آب و ہوا۔ نسل۔ زبان معتقدات اور معاشرتی نظام میں گوناگوں اختلافات ہیں۔ اس لئے یہاں کسی محکم دستوری نظام کے لئے صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے، اور وہ یہ کہ یہاں زبان۔ نسل۔ تاریخ مذہب

---

[1] یعنی جو غیر مسلم سود کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی شرح سود پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ حالانکہ حکومت کے مذہب میں سود حرام تھا۔

کی وحدت اور اقتصادی مفاد کی یکسانیت کی بنیادوں پر خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں
سائمن رپورٹ نے فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین انتخاب
عام سے مرتب نہ کی جائے بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے مختلف نمائندوں کی مجلس ہو۔ نیز
سائمن رپورٹ میں یہ چیز بھی موجود ہے کہ ملک کو مختلف علاقوں میں نئے سرے سے اسی
اصول پر تقسیم کیا جائے۔ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ سائمن کمیشن کی ان سفارشات کی میں
پوری پوری تائید کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ میں اس اضافہ کی بھی جرأت کرتا ہوں
کہ صوبوں کی جدید تقسیم دو شرطوں کے ماتحت ہونی چاہیئے۔ اول یہ کہ یہ تقسیم جدید دو شرطوں
کے نفاذ سے پہلے ہو جانی چاہیئے اور دوسرے اس کی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اس
سے آئندہ دن کے فرقہ وارانہ بکھیڑوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ اگر صحیح طریق
پر صوبوں کی جدید تقسیم عمل میں آگئی تو ہندوستان کے آئینی مباحث میں سے جداگانہ
اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کا مسئلہ خود بخود معدوم ہو جائے گا۔ کیوں کہ موجبات کی
موجودہ ترکیب ہی موجودہ منافشات کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ہندو کا خیال
کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا اصول حقیقی قومیت پرستی کے منافی ہے۔
کا جو تصور اس نے قائم کیا ہے اس سے مفہوم یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اور
فرقے یوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں کہ کسی جماعت کا جداگانہ انفرادی
تشخص باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حالات موجود نہیں اور نہ اس کا ہونا
مناسب ہے، ہندوستان مختلف النسل اور مختلف المذاہب انسانوں کا ملک ہے اس کے
ساتھ ہی مسلمانوں کی عام اقتصادی پستی تمام ہندوستان میں بالعموم اور پنجاب میں
بالخصوص ان کا لاتعداد فرقہ ہے صوبوں میں ان کی ایسی ناکافی اکثریت جو کسی وقت

اقلیت میں بدلی جاسکتی ہے۔ اگر ان امور کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو آپ پر یہ بالکل واضح ہو جائے گا کہ ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے لئے اس قدر مضطرب کیوں ہیں؟ ایسے ملک میں اور ایسے حالات کے ماتحت فیڈریشن میں اگر اقوام کی نمائندگی کی بجائے صوبوں کی نمائندگی ہو تو اس سے ہر ایک طبقہ کے مفاد کی صحیح صحیح نمائندگی نہیں ہو سکے گی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ زمام حکومت چند افراد کے ہاتھ میں (Oligarchy) رہے گی۔ ہاں! اگر موجودہ صوبہ جاتی تقسیم کی جائے ہندوستان کی جدید تقسیم مختلف قوموں کی لسانی، نسلی تمدنی "کلچرل" اور مذہبی ہم آہنگی کی بنیاد پر کر دی جائے تو مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ فیڈریشن میں بجائے مختلف اقوام کی نمائندگی کے مختلف علاقوں کی نمائندگی ہو۔

سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل حکومت کے اختیارات کا تعلق ہے جو نظام حکومت ہندوستانی پنڈتوں" (یعنی نہرو رپورٹ) اور انگلستانی پنڈتوں" (یعنی سائمن رپورٹ) نے تجویز کیا ہے۔ اس کی پشت پر جو جذبات کارفرما ہیں۔ ان میں ایک الباباریک فرق ہے جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہندوستانی پنڈت" مرکز کو بحالت موجودہ قائم رکھنا چاہتے ہیں (یعنی وہ فیڈریشن کی بجائے یونیٹری (Unitary) کی شکل کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں تمام صوبے مرکز کے ماتحت رہتے ہیں) ان کی خواہش یہ ہے کہ حکومت کی باگ ڈور مرکزی اسمبلی کے ہاتھ میں ہو جسے وہ بصورت موجودہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موجودہ

نامزدگی Nomination کا سلسلہ ختم ہوجانے پر مرکزی اسمبلی میں اُن کی اکثریت اور بھی زیادہ مضبوط و مستحکم ہوجائے گی، برعکس اس کے چونکہ "انگلستانی پنڈت" یہ محسوس کرتے ہیں کہ مرکز کی جمہوریت ان کے مفاد کے خلاف جائے گی۔ اور اگر ذمہ دار حکومت کے حصول کے لئے ایک قدم بھی آگے بڑھا تو جملہ اختیارات آج ان کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ بھی اُن سے چھن جائیں گے۔ اس لئے یہ جمہوری نظام کو مرکز کے بجائے صوبوں کی طرف منتقل کر دینے کی فکر میں ہیں۔ بلاشبہ وہ فیڈریشن کے اصول کی ترویج کر رہے ہیں اور چند تجاویز کی رُو سے انہوں نے اس کا آغاز بھی کر دیا ہے۔ لیکن جن مقاصد کے پیش نظر وہ اس اصول کی قدر و قیمت متعین کر رہے ہیں وہ ان مقاصد سے بالکل مختلف ہیں جن کے ماتحت ہندوستان کے مسلمان اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ مسلمان فیڈریشن کا مطالبہ اس لئے کرتے کہ اس کے ذریعہ سے ہندوستان کا مشکل ترین عقدہ یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہوجائیگا۔ لیکن شاہی کمیشن (Royal commission) کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہے۔ وہ اصولاً کتنا ہی درست و محکم کیوں نہ ہو انکی غرض و غایت یہ معلوم نہیں ہوتی کہ فیڈرل ریاستوں کو مکمل طور پر خود مختار کر دیں حقیقت یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت کے نفاذ سے برطانیہ کے لئے جو صورت حالات پیدا ہوگی۔ اس سے بچاؤ کی کوئی شکل نکل آئے انہیں فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی کوئی فکر ہی نہیں۔ اس لئے وہ اسے جوں کا توں چھوڑ رہے ہیں۔ اس سے عیاں ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے۔ سائمن رپورٹ فیڈریشن کے اصول کی اصلی ماہیئت کو ہی رد کر رہی ہے۔

نہرو رپورٹ کے مخالفین اس چیز کو بھانپ کر مرکزی اسمبلی میں اکثریت ہندوؤں کو حاصل ہوگی وحدانی نظامِ حکومت (*Unitary form of Govt.*) کی تجویز پر آگئے ہیں کیونکہ اس نظامِ حکومت کی رو سے ہندوؤں کو سارے ہندوستان پر عام غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ سائمن رپورٹ برائے نام فیڈریشن کے چلمنی پردہ کی آڑ میں موجودہ برطانوی اقتدار کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اہلِ برطانیہ قدرتی طور پر اس اقتدار سے دستکش نہیں ہونا چاہتے جو انہیں آج تک حاصل رہا ہو اور کچھ اس لئے کہ اگر ہندوستان کی مختلف اقوام میں باہمی سمجھوتہ ہو تو اہلِ برطانیہ کو بہانہ مل جاتا ہے کہ موجودہ طاقت اپنی ہی ہاتھوں میں رکھیں۔ جہاں تک وحدانی نظامِ حکومت کا تعلق ہے وہ تو میرے نزدیک آزاد ہندوستان میں قابلِ التفات ہی نہیں باقی رہی فیڈریشن تو وہ اس قسم کی ہونی چاہیئے کہ اس میں باقیماندہ اختیارات (*Residuary Powers*) کلیتہً خود مختار ریاستوں کے ہاتھ میں ہیں اور مرکزی فیڈرل حکومت صرف انہی اختیارات کے استعمال کی اہل ہو جو مختلف آزاد ریاستیں اپنی رضامندی سے اس کی تحویل میں دیدیں۔ مسلمانانِ ہند کو کبھی ایسے نظام کے منظور کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا جس میں حقیقی فیڈریشن کا اصول ناپید ہو یا جس میں مسلمانوں کی انفرادی ملی ہستی کو تسلیم نہ کیا جائے، خواہ وہ نظام برطانوی الاصل ہو یا ہندی الاصل

فیڈرل اسکیم اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس مرکزی حکومت کی وضع وہیئت میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس اگرچہ اس سے بہت پہلے ہو رہا تھا جبکہ برطانیہ نے اس کے نفاذ کے موثر ذرائع اختیار

کرنے کا خیال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس امر کا اعلان کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیانِ ریاست کی شرکت بھی نہایت ضروری ہے۔ بہت دیر کے بعد کیا گیا۔ والیانِ ریاست کی طرف سے گول میز کانفرنس میں وقتہً آل انڈیا فیڈریشن میں شرکت پر آمادگی کا اظہار۔ اور اس اعلان کے ساتھ ہی ہندو مندوبین کا جواب تک وحدتی نظامِ حکومت کے بالکل غیر متزلزل حامی چلے آتے تھے۔ خاموشی سے فیڈرل اسکیم کی ترتیب پر اظہارِ رضامندی باشندگانِ ہند کے لئے علی العموم اور اقلیتوں کے لئے علی الخصوص بڑا تعجب انگیز تھا۔ حتیٰ کہ مسٹر شاستری نے بھی جنہوں نے چند ہی روز قبل ہندوستان کے لئے فیڈرل اسکیم کی سفارش کی پاداش میں سرجان سائمن پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی تھی اپنی رائے بدل لی۔ اور اس تبدیلی رائے کا کانفرنس کے پہلے اجلاس عام میں اعتراف کیا اور اس طرح وزیر اعظم انگلستان کے لئے اپنی افتتاحی تقریر میں ایک نہایت برجستہ فقرہ چست کرنے کا سامان فراہم کر دیا۔

انگریزوں کی یہ خواہش کہ والیانِ ریاست آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہو جائیں اور ہندوؤں کا یہ اقدام کہ انہوں نے فیڈرل حکومت کو بلا تامل منظور کر لیا خالی از علت نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ والیانِ ریاست (جن میں مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل ہے) کے فیڈریشن میں شامل ہونے سے دو نتیجے بالکل عیاں ہیں۔ یعنی یہ چیز ایک طرف تو ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے اعلیٰ حالہ استحکام اور استقرار کا بڑا عمدہ ذریعہ بن جائے گی۔ اور دوسری طرف آل انڈیا فیڈرل اسمبلی میں ہندوؤں کو ایک زبردست اکثریت حاصل ہونے کا موجب ہو گی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرکزی حکومت کی آخری وضع و ہیئت

کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو برطانوی مدبرین نہایت شاطرانہ انداز سے والیانِ ریاست کے مہروں کی وساطت سے اپنی مطلب برآری کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ ادھر والیانِ ریاست کو اس سکیم میں اپنی مطلق العنان حکومت کے برقرار رکھنے کے بہتر امکانات نظر آرہے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے خاموشی کے ساتھ کسی ایسی سکیم کو منظور کر لیا تو وہ یاد رکھیں کہ اس طرح وہ اپنی جداگانہ ملی ہستی کی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود ڈالیں گے۔ ہندوستان میں اس وضع کی فیڈرل حکومت کی پالیسی حقیقتاً ہندو والیانِ ریاست کے ہاتھ میں ہوگی۔ کیونکہ مرکزی فیڈرل اسمبلی میں انہی کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی اور وہ ان تمام معاملات میں جن کا تعلق برطانوی شہنشاہیت سے ہوگا۔ تاج برطانیہ کی پوری پوری حمایت کرینگے۔ اور جہانتک اندرونی نظم ونسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کے تسلط اور اقتدار کو برقرار رکھنے اور اسے اور زیادہ مستحکم کرنے میں ہر طرح کی مدد دینگے۔ بہ الفاظ دیگر اس سکیم کا مقصد یہ ہے کہ برطانوی امپیریلزم اور ہندو انڈیا میں ایک ایسا سودا ہو جائے جس کی رُو سے ہندو ہندوستان میں انگریز کے وجود کو دائمی بنا دیں اور انگریز اس کے صلہ میں ہندوستان میں ہندوؤں کو ایک ایسا نظامِ حکومت عطا کر دیں جس میں تمام دیگر اقوام ہندوؤں کی مستقل غلامی کے پھندے میں جکڑی رہیں۔ لہٰذا اگر برطانوی ہند کے صوبوں کو حقیقی معنوں میں خود مختار ریاستوں میں تشکیل نہ کیا گیا تو ہندوستان کی فیڈریشن میں والیانِ ریاست کی شمولیت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہ سمجھا جائے گا کہ انگریز اپنے خاص شاطرانہ انداز میں

ایسی چال چلنا چاہتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے کچھ نہ جائے۔ اور ہر ایک کو خوش بھی کر دیا جائے یعنی مسلمان کو فیڈریشن کے نقطی کھلونے سے۔ ہندو کو مرکز میں اکثریت سے اور برطانوی ملوکیت کو خواہ وہ ٹوری (Tory) ہوں یا لیبر (Labourites) حقیقی اختیارات کی تفویض سے۔ ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد مسلم ریاستوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں سے مرکب مرکزی ایوان (House) یا ایوانوں (Houses) میں مسلمانوں کے تنتیس فی صدی مطالبہ کو کس طرح پورا کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیڈریشن کی جس سکیم پر گول میز کانفرنس میں بحث ہوئی ہے۔ مسلم مندوبین اس کے متعلقات سے پورے طور پر آگاہ ہیں۔ مجوزہ آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ ابھی تک زیر بحث نہیں آیا۔ رپورٹ نے ملخصاً لکھا ہے:۔

"فیڈرل کمیٹی کی سفارشات کے مسودہ (Interim report) میں دو ایوانوں کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ دونوں میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندے شریک ہوں گے۔ ان کے تناسب کے معاملہ پر بعد میں فیڈرل سب کمیٹی ان عنوانات کے زیر نظر غور کرے گی جو ابھی اس کمیٹی کے لئے متعین نہیں کئے گئے۔"

میری رائے میں تناسب کا معاملہ بے حد اہم ہے اور اسمبلی کی وضع ہیئت کے ساتھ ہی طے ہونا چاہیئے تھا۔ میرے خیال میں بہترین طریق کار یہ تھا۔ کہ سردست صرف برطانوی ہند کے صوبوں کی فیڈریشن بنائی جاتی ہے۔ فیڈریشن کی جس سکیم کا

کا آغاز جمہوریت (صوبوں کے منتخب شدہ نمائندے) اور استبداد (ریاستوں کے نامزدہ نمائندے) کے غیر مقدس اتحاد سے ہوگا۔ اس سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ کہ ہندوستان وحدتی نظام حکومت کے گورکھ دھندے میں الجھا رہے ہیں۔ یہ وحدتی نظام انگریزوں کے لئے۔ برطانوی ہند کی سب سے بڑی قوم کے لئے (یعنی ہندوؤں کے لئے) اور والیانِ ریاست کے لئے بہت سے فوائد کا سرچشمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اس سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جب تک انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں مکمل اختیارات (یعنی باقیماندہ اختیارات Residuary Powers) فیڈریشن کے بجائے صوبوں کی تحویل میں نہ دئیے جائیں) کے ساتھ اکثریت حاصل نہ ہو جائے۔ نیز فیڈرل اسمبلی کے ارکان کی مجموعی تعداد میں سے ایک تہائی نشستیں نہ مل جائیں۔ جہاں تک برطانوی ہند کے صوبوں کو کامل اختیارات تفویض کرنے کا تعلق ہے۔ اعلیٰحضرت نواب صاحب بھوپال۔ سر اکبر حیدری اور مسٹر جناح کا مطالبہ نہایت مستحکم بنیادوں پر مبنی ہے۔ چونکہ اب والیانِ ریاست بھی ہندوستانی فیڈریشن میں شامل ہو رہے ہیں۔ اس لئے برطانوی ہند کی اسمبلی میں مسلمانوں کی نیابت کے مسئلہ پر ازسر نو غور ہونا چاہیئے۔ اب سوال صرف برطانوی ہند کی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا نہیں۔ بلکہ تمام ہندوستان کی فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہند کے مسلمانوں کی نیابت کا ہے۔ اب ہمارا یہ مطالبہ یوں پیش ہونا چاہیے کہ ہمیں آل انڈیا فیڈرل اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں دی جائیں اور فیڈریشن میں شامل ہونے والی مسلم ریاستوں کی نمائندگی کو اس ایک

تہائی سے علیحدہ رکھا جائے۔

مسئلہ دفاع (Defence)

ایک اور مشکل مسئلہ جو ہندوستان میں فیڈریشن کو کامیابی سے چلانے کے راستہ میں مزاحم ہو رہا ہے۔ ہندوستان کی مدافعت کا مسئلہ ہے۔ شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ہندوستان کی تمام خامیوں کو ابھار کر سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ تاکہ فوج کے نظم و نسق کی باگ ڈور حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں رکھنے کے لئے وجوہ جواز پیدا کر سکیں۔ ارکانِ کمیشن لکھتے ہیں کہ :-

"ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کچھ اس قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ ہندوستان کے دفاع کو اس وقت یا مستقبل قریب میں ایسا مسئلہ نہیں قرار دیا جا سکتا جس کا تعلق خالصتہً ہندوستان سے ہو۔ فوج پر کامل اختیارات اک معظم کی حکومت کے کارندوں کے ہوں گے اور وہی اس کا نظم و نسق کریں گے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذکورہ صورت حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ ہند میں ذمہ دار حکومت کی طرف پیش قدمی کا دروازہ اس وقت تک بند سمجھا جائے جب تک ہندوستان برطانوی افسروں اور برطانوی فوجوں کی امداد کے بغیر اپنی مدافعت کا پورا اہل نہ بن جائے۔ بحالات موجودہ آئینی ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ

تو ضرور موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر نہرو رپورٹ کی تجویز کیمطابق اس امر پر اصرار کیا جائے کہ کسی آئندہ تغیر و تبدل میں یہ بات بھی شامل ہے کہ فوج کا نظم و نسق منتخب مجلس وضع قوانین کی تحویل میں چلا جائے۔ تو اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ جو امیدیں بندھ رہی ہیں کہ مرکزی حکومت ارتقائی منازل طے کرکے اس نصب العین تک پہنچ جائے جس کا ذکر ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان میں کیا گیا ہے۔ وہ ایک غیر معین مدت تک کے لئے دھری کی دھری رہ جائیں گی۔"

اپنی اس دلیل کو اور زیادہ مستحکم کرنے کے لئے ارکان کمیشن نے اس بات پر بھی زور دیا ہے۔ کہ ہندوستان میں ایسے مذاہب موجود ہیں۔ جو ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور ایسی قومیں موجود ہیں جن کی قومیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور جن میں باہمی چشمک ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ اور ارکان کمیشن نے یہ کہہ کر مسئلہ کو بالکل لاینحل بنانے کی کوشش کی ہے کہ

"یہ حقیقت کہ ہندوستان عام محاورہ کے مطابق ایک واحد قوم (Nation) نہیں ہے۔ کہیں اتنی ابھر کر سامنے نہیں آتی جتنی اس خیال کو پیش نظر رکھنے سے نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی عسکری اور غیر عسکری اقوام میں کتنا بڑا فرق ہے۔"

کمیشن نے مسئلہ کے ان پہلوؤں کو اس شد و مد سے بیان کرکے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ انگریز ہندوستان کو محض بیرونی خطرات ہی سے محفوظ نہیں کر رہے بلکہ اس کے اندرونی امن و سکون کے بھی غیر جانبدار محافظ ہیں۔

فیڈریشن کا جو نظام میرے ذہن میں ہے اس کی رُو سے ہندوستان میں فیڈریشن کے نافذ ہو جانے کے بعد صرف بیرونی حفاظت ہی کا سوال باقی رہ جائیگا۔ تمام صوبوں میں داخلی امن کے قیام کے لئے لازماً فوجیں موجود ہونگی ان کے علاوہ ہندوستان کی فیڈرل کانگریس۔ ہندوستان کی شمال و مغربی سرحد پر ایک طاقت ور سرحدی فوج متعین کر دے گی۔ جس میں عام صوبوں کے دستے شامل ہوں گے اور تمام قوموں سے قابل و کارواں فوجی افسروں کے ہاتھ میں ان کی قیادت ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں اس وقت قابل فوجی افسر موجود نہیں ہیں اور کمیشن کے ارکان نے اسی امر واقعہ کو پیش کرکے نظم و نسق فوج کو ملک معظم کی حکومت کے ہاتھ میں رکھنے کے لئے وجہ جواز پیدا کی ہے۔ اس معاملہ کے متعلق مدراس سائمن رپورٹ سے ایک اور اقتباس پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو میری رائے میں خود کمیشن کی اختیار کردہ پوزیشن کے خلاف ایک محکم دلیل ہے۔ رپورٹ مظہر ہے کہ :-

"جن ہندوستانیوں کو ملک معظم کی طرف سے شاہی کمیشن ملا ہوا ہے ان میں سے کسی کو بہ حالت موجودہ کپتانی سے اونچا فوجی منصب حاصل نہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق اس وقت ۹۰ کپتان ہیں جن میں سے ۳۵ عام رجمنٹوں میں مامور ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر اتنی ہے کہ اگر وہ ضروری امتحانات پاس بھی

کریں تو بھی پنشن پانے سے پیشتر کپتانی سے اونچا عہدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اکثر ایسے ہیں جنھوں نے سینڈ ہرسٹ کے فوجی کالج میں تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ جنگ عظیم میں انہیں کمیشن مل گئے۔ جب حالت یہ ہو تو تغیر کی حالت کتنی ہی مخلصانہ اور اسے عمل میں لانیکی کوشش کتنی ہی سرگرم کیوں نہ ہو ظاہر ہے کہ نشو ونما وارتقاء کی رفتار بہت سست اور مدہم رہے گی اس سلسلے میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ان حالات کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ جو سکین کمیٹی نے (جس کے ممبر سب دیسی شرفاء تھے) ان موثر الفاظ میں بیان کئے ہیں کہ ترقی بہرحال اس امر پر موقوف ہے کہ ہر مرحلہ میں کامیابی حاصل کی جائے اور فوجی صلاحیت کو برقرار رکھا جائے۔" موجودہ ہندوستانی افسر تمام کے تمام چھوٹے درجے کے ہیں اور ان کا تجربہ بہت محدود ہے ان میں سے اونچے درجے کے افسر قلیل مدت میں پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ جب تک افسروں کے درجے میں موزوں ہندوستانیوں کی بھرتی کی تعداد میں معتدبہ اضافہ نہیں ہوگا (اور ہم ان کی تعداد میں اضافے کے دل سے خواہاں ہیں)، جب تک ہندوستانیوں کی کافی تعداد تعلیم و تجربہ حاصل کرکے اس قابل نہیں ہو جائے گی کہ کم از کم چند ہندوستانی رجمنٹوں کے سارے عہدے سنبھال سکیں۔ جب تک ایسے دستے اپنی صلاحیت کا پورا عملی ثبوت نہ دیں گے۔ جب تک ہندوستانی افسر کامیاب فوجی خدمت کے ذریعہ اعلیٰ کمان کے قابل نہیں بن جائیں گے۔ اسوقت تک یہ پالیسی کہ تمام فوج ہندوستانی افسروں پر مشتمل ہو بروئے کار نہیں لائی جا سکتی۔ پھر بھی اس اسکیم کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے سالہا سال درکار ہونگے۔" اب میں یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس صورت حالات کا ذمہ دار

کون ہے؟ کیا یہ بیماری عسکری اقوام کی فطری ناقابلیت کا نتیجہ ہے۔ فوجی تعلیم دینے کی سستی رفتار کا؟ ہماری عسکری اقوام کی فوجی صلاحیت ناقابل انکار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ فوجی تعلیم کے لئے دوسری تعلیمات کے مقابلے میں زیادہ وقت درکار ہو۔ میں فوجی معاملات کا ماہر نہیں ہوں کہ اس چیز کا صحیح اندازہ کرسکوں۔ لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے میں محسوس کرتا ہوں کہ مذکورہ استدلال کے مطابق یہ لائحہ عمل تو ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہے کہ ہندوستان ہمیشہ کے لئے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہے۔ لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہے کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی فوج کے مسئلہ کو ایک ایسی کمیٹی کے حوالے کر دیا جائے جس کے عناصر ترکیبی کا فیصلہ باہمی سمجھوتہ سے کر لیا جائے۔ اگر یہاں فیڈرل حکومت قائم ہوگئی تو مجھے یقین ہے کہ اسلامی ریاستیں ہندوستان کی حفاظت کے لئے ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج اور غیر جانبدار ہندوستانی بحری طاقت کی تعمیر پر بصد خوشی رضامند ہو جائیں گی۔ مغلوں کے عہد میں اس قسم کی غیر جانبدار دفاعی فوج موجود تھی بلکہ اکبر کے زمانے میں سرحد ہند کی محافظ فوج کے تمام جرنیل ہندو تھے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ فیڈرل حکومت کے ماتحت غیر جانبدار ہندوستانی فوج کی یکسم کے پیش نظر مسلمانوں کے متعلق ہندوؤں کے یہ شکوک بھی بالکل رفع ہو جائیں گے۔ کہ مسلمانانِ ہند بیرونی حملے کی صورت میں اپنے ماورائے سرحد کے مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

دوسری شکل

میں نے اختصار کے ساتھ یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو میری رائے میں اس ملک کے دو نہایت اہم آئینی مسئلوں کے متعلق کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہیئے: مسلمانوں کا اہم مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کی از سرِ نو اس انداز پر تقسیم کی جائے کہ اس سے فرقہ دارانہ مسئلہ کا مستقل طور پر حل ہو جائے (یعنی صوبوں کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ ان میں ہر قوم کو اپنی تہذیب کے مطابق اپنی نشو و نما میں کامل آزادی حاصل ہو) لیکن اگر مسلمانوں کا یہ مطالبہ قابل التفات نہ سمجھا جائے تو میں پورے زور کے ساتھ ان اسلامی مطالبات کی تائید کرتا ہوں جو آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی طرف سے بار بار پیش کئے جا چکے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کسی ایسے آئینی تغیر پر ہرگز رضامند نہیں ہو سکتے جو جداگانہ انتخاب اور پنجاب اور بنگال میں ان کے حقوقِ اکثریت پر اثر انداز ہو یا اس امر کی ضمانت نہ دے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین میں ان کی نیابت ایک تہائی یقینی طور پر ہوگی۔ مسلمانوں کے سیاسی رہنما اس سے پہلے دو موقعوں پر غلطی کھا چکے ہیں۔ اول میثاق لکھنؤ جس کی تخلیق ہندوستان میں "متحدہ قومیت" کے نظریہ کے ماتحت کی گئی اور جس کی رو سے مسلمانانِ ہند کے سیاسی اقتدار کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے۔ دوسرے وہ کوتاہ نگہی جو پنجاب کے مسلمانوں کی دیہاتی (Rural) اور شہری (Urban) تقسیم کا موجب بنی اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور یوں پنجاب کے مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں بدل گئی۔ لیگ کا فرض ہے

کہ وہ میثاق لکھنؤ اور مسلمانانِ پنجاب کے دیہاتی اور شہری تقسیم کی تجویز کی مذمت کرے۔
سائمن رپورٹ نے مسلمانانِ پنجاب اور بنگال کے لئے آئینی اکثریت (Statutory Majority) کی سفارش نہیں کی اور اس طرح مسلمانوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے۔ اور یوں مسلمانوں کے لئے اس کے سوائے کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ کہ وہ یا تو میثاق لکھنؤ پر قانع رہیں یا مخلوط انتخاب کی اسکیم منظور کریں۔
سائمن رپورٹ کے متعلق حکومت ہند کے خریطہ (Despatch) میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ رپورٹ شائع ہونے کے وقت سے لیکر اس وقت تک مسلمانوں نے ان تجاویز میں سے کسی ایک کے قبول کرنے کے متعلق بھی رضامندی کا اظہار نہیں کیا۔ حکومت ہند نے اس خریطہ میں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو حقوق اکثریت سے اس بنا پر محروم کر دینا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہو انہیں انہیں زائد نشستیں (Weightage) دی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے لئے جائز شکایات کا موجب ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کی اس مجوزہ بے انصافی کی تلافی نہیں کی۔ بہر نوع لارڈ ارون اور ان کی حکومت نے تسلیم کر لیا ہے کہ اکثریت کے لئے فرقہ وارانہ نیابت اس وقت تک باقی رہنی چاہئے جب تک کہ حق رائے دہندگی (Franchise) کو اتنا وسیع نہ کر دیا جائے کہ اس سے ہر قوم کے ووٹ دینے والوں کی تعداد کا تناسب قریب قریب وہی ہو جائے جو آبادی کا تناسب ہے اور دوسرے جب تک صوبہ کی مجلس مقننہ کے مسلم ارکان دو تہائی اکثریت کے ساتھ بذاتِ خود دست برداری پر رضامندی کا اظہار نہ کریں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ

باوجودیکہ حکومت ہند مسلمانوں کی شکایت کو حق بجانب تسلیم کرتی ہے پھر بھی اس کو یہ ہمت کیوں نہیں پڑتی کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو آئینی اکثریت دینے کی سفارش کرے۔

مسئلہ سندھ

ہندوستان کے مسلمان کسی ایسے نظام پر رضامند نہیں ہو سکتے جس میں سندھ کو ایک مستقل صوبہ بنایا جائے۔ اور صوبہ کی سرحد کی سیاسی حیثیت دوسرے صوبوں کے برابر نہ کر دی جائے۔ مجھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ سندھ کو بلوچستان کے ساتھ ملا کر ایک مستقل صوبہ کیوں نہ بنا دیا جائے۔ سندھ اور احاطہ بمبئی میں تو کوئی چیز بھی مشترک نظر نہیں آتی خود ارکان کمیشن اعتراف کرتے ہیں کہ طریق بود و ماند اور تمدن کے اعتبار سے سندھ ہندوستان کی بجائے عرب اور عراق سے زیادہ قریب ہے۔ مشہور مسلم جغرافیہ دان مسعودی نے اس حقیقت کو بہت پہلے محسوس کرایا تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ سندھ ایک ایسا ملک ہے جسے ہندوستان کی بجائے ممالک اسلامیہ سے زیادہ قرب حاصل ہے۔ روایت ہے کہ اس خاندان کے پہلے حکمران نے مصر کے متعلق کہا تھا کہ اس کی پشت افریقہ کی طرف ہے اور منہ عرب کی طرف۔ ضروری ترمیمات کے ساتھ یہی قول سندھ کی اصلی پوزیشن کو بھی واضح کر دیتا ہے۔ مصر کی طرح سندھ کی بھی پشت ہندوستان کی طرف ہے اور منہ وسط ایشیا کی طرف۔ علاوہ بریں جب ہم سندھ کے زراعتی وسائل اور معاملات پر غور کرتے ہیں جو اپنے متعلق حکومت بمبئی کے دل میں کبھی جذبات ہمدردی پیدا نہیں

کر سکتے۔ نیز جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ کراچی لازماً نشوونما پاکر ہندوستان کا دوسرا سب سے بڑا تجارتی شہر بن جائے گا اور اس سے سندھ کی تجارت میں لامتناہی ترقی کے امکانات پیدا ہو جائیں گے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ سندھ کو حاطہ بمبئی کے ساتھ وابستہ رکھنا تدبر اور دور اندیشی کے منافی ہے کیونکہ اگرچہ آج ان دونوں کے درمیان بظاہر کش مکش نہیں لیکن مستقبل قریب میں ان کے درمیان جذبات رقابت پیدا ہونے کے بہت امکانات ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ علیحدگی سندھ کے راستے میں مالی مشکلات حائل ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق آج تک میرے سامنے کوئی قطعی اور مستند بیان نہیں آیا۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ واقعی اس قسم کی مشکلات موجود ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ہند ایک ہونہار صوبہ کو مستقل نشوونما کی جدوجہد میں عارضی طور پر مالی امداد دینے کے لئے آمادہ کیوں نہیں ہوتی۔

صوبہ سرحد

صوبہ سرحد کے متعلق یہ دیکھ کر بے حد قلق ہوتا ہے کہ ارکان کمیشن نے اس امر سے انکار ہی کر دیا ہے کہ اس صوبہ کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا کوئی حق حاصل ہے۔ کمیشن نے صوبہ سرحد کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ بڑے کمیٹی کی تجاویز سے بھی کم ہیں۔ اور اس صوبہ کے لئے جو کونسل تجویز کی گئی ہے اسے چیف کمشنر کی مطلق العنانی کو چھپانے کے لئے ایک نظر فریب پردے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ افغان کے سگریٹ سلگانے فیڈری حق محض اس لئے چھین لیا

گیا ہے کہ وہ اتفاق سے بارودخانہ (*Powder House*) میں مقیم ہے۔ ارکان کمیشن کا یہ تمثیلی استدلال بظاہر کتنا ہی خوش آیند کیوں نہ ہو لیکن ہم بہرحال قابلِ اطمینان سیاسی اصلاحات کو "روشنی" کہنا چاہیئے نہ کہ "آگ" اور روشنی کا ہر انسان حقدار ہے خواہ وہ بارود خانہ کے اندر مقیم ہو یا کوئلہ کی کان میں۔ افغان بہادر ہے، بالغ نظر ہے اور اپنے جائز حقوق کے لئے ہر تکلیف برداشت کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ اس لئے اسے کامل خود اختیاری حکومت کے مواقع سے محروم کرنے کی جو کوشش کی جائے گی وہ یقیناً اس کی برافروختگی کا باعث ہوگی۔ ہندوستان اور انگلستان دونوں کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ اس قوم کو مطمئن رکھا جائے۔ حال ہی میں اس بدنصیب صوبے میں جو الم انگیز واقعات پیش آ چکے ہیں وہ اسی ناروا سلوک کا نتیجہ ہیں جو ہندوستان میں خود اختیاری حکومت کا اصول نافذ کرنے کے وقت سے اہل سرحد کے ساتھ روا رکھا گیا۔ مجھے امید ہے کہ برطانوی مدبرین صوبہ سرحد کی موجودہ بے چینی کو بیرونی اسباب کا نتیجہ قرار دیکر صورت حالات کے صحیح اندازہ سے چشم پوشی نہیں کریں گے۔

صوبہ سرحد کے متعلق حکومت ہند کے خریطہ میں جو سفارشات کی گئی ہیں وہ بھی اطمینان بخش نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس خریطہ میں ایک نام نہاد مجلس نمائندگان اور ایک نیم نمائندہ (*Semi-representative*) سی کابینہ مہیا کر کے سائمن رپورٹ کی سفارشوں پر اضافہ کر دیا گیا ہے لیکن یہ محض اشک شوئی ہے کیونکہ اس اہم ترین مسلم صوبے کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کی سطح پر نہیں لایا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ افغان فطرتاً ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں جمہوری ادارات کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

گول میز کانفرنس

میرا فرض ہے کہ اب میں گول میز کانفرنس کے متعلق بھی کچھ عرض کروں۔ ذاتی طور پر گول میز کانفرنس کے نتائج کے متعلق میری توقعات کچھ زیادہ خوش آیند نہیں ہیں۔ امید تو یہ تھی کہ فرقہ وارانہ مناقشات کی کش مکش گاہ سے دور تر فضا زیادہ بصیرت افروز ہوگی۔ اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں اختلافات کا مخلصانہ تصفیہ آزادیٔ ہند کے مقصد کو قریب تر لے آئے گا۔ لیکن واقعات کچھ اور ہی داستان سنا رہے ہیں۔ لندن میں فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق جو بحث و تمحیص ہوئی اس سے یہ حقیقت کہ ہندوستان میں ان دو بڑی تہذیبوں کی حامل اقوام میں کس قدر اصولی اختلافات موجود ہیں۔ اس انداز سے عریاں ہوئی کہ اس سے پیشتر شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو۔ اس کے باوجود وزیر اعظم انگلستان اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ قومی مسئلہ نہیں۔ بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وزیر اعظم نے کہا کہ "میری حکومت کے لئے یہ مشکل ہوگا کہ وہ پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخاب کے حق میں تجاویز پیش کرے۔ اس لئے کہ مخلوط انتخاب کے اصول کو برطانیہ کے خیالاتِ جمہوریت کے ساتھ زیادہ مطابقت حاصل ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ وزیر اعظم انگلستان نے یہ سوچا ہی نہیں کہ ایک ایسی سرزمین میں جہاں مختلف قومیں آباد ہوں برطانوی جمہوریت کے نمونہ کوئی نظامِ حکومت

قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔ اور اس نے یہ بھی نہیں سمجھا (کہ مخلوط انتخاب تو ایک طرف) خود جداگانہ انتخاب بھی اس تجویز کا نعم البدل نہیں ہو سکتا جو تہذیبی خطوں کے مطابق صوبوں کی اور سر نو تقسیم پر مشتمل ہے۔ اقلیتوں کی سب کمیٹی میں بھی اطمینان بخش تصفیہ کی کوئی امید نہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے ہو اور ہمارا خیال ہے کہ تیز بین برطانوی مدبرین اکثر ہندوستانی سیاست دانوں کی طرح اس مسئلہ کو سطحی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ بلکہ اس کی گہرائیوں میں اتر کر ہندوستان جیسے ملک میں امن و سکون کے صحیح اصول و مبانی کا واضح طور پر مشاہدہ کریں گے۔ ہندوستان کے لئے نظامِ حکومت کی بنیاد "متحدہ قومیت" کے غلط تصور پر رکھنا یا یہاں ان اصولوں کو ٹھونسنا جو برطانیہ کے انداز جمہوریت کے رہینِ منت ہوں، ہندوستان سے دوستی نہیں بلکہ اسے نادانستہ خانہ جنگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ جہاں تک میری بصیرت کام دیتی ہے اس ملک میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف اقوام کو ایسے مواقع بہم نہ پہونچائے جائیں کہ وہ اپنے ماضی کے تجربِ مقدس سے پیوستہ رہتے ہوئے عصرِ حاضر کے داعیات کے مطابق خود مختارانہ اپنی ملت کی نشوونما کر سکیں۔

ہندوستانی متحدہ قومیت کا کوئی وجود نہیں مسلمان صحیح معنوں میں ایک قوم ہیں

مقام مسرت ہے کہ ہمارے مسلم مندوبین اس مسئلہ کو صحیح اصول پر حل کرنے کی اہمیت سے پورے طور پر آگاہ ہیں جسے میں نے ہندوستان کا بین الاقوامی

مسئلہ کہا ہو وہ اس بات پر زور دینے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ مرکزی حکومت میں خود مختارانہ
حکومت کے مسئلہ سے پیشتر فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ کر لیا جائے۔ کسی مسلم سیاست داں کو
فرقہ پرستی (   ) کے طعنے سے گھبرانا نہیں چاہیئے جسے اغیار نے
محض مخالفانہ پروپیگنڈہ کے لئے اختیار کیا ہے اور اسے اس غرض سے ایجاد کیا گیا ہے کہ اہل برطانیہ
کے جذبات جمہوریت کو اپیل کرکے اپنا الو سیدھا کیا جائے اور اس طرح ہندوستان میں جس چیز
(متحدہ قومیت) کا وجود ہی نہیں اسے انگلستان کو باور کرا کر اسے خواہ مخواہ غلط راستہ پر لگا دیا جائے۔ آج اسوقت
سر دھڑ کی بازی لگ رہی ہے۔ ہم تعداد میں بھی سات کروڑ ہیں۔ اور ہندوستان کی کوئی دوسری قوم ایسی نہیں جو
ہماری طرح یک رنگ و ہم آہنگ ہو۔ بلکہ ہندوستان کی تمام اقوام میں صرف مسلمان
ہی ایک ایسی قوم ہے جس پر صحیح معنوں میں موجودہ زمانے کے مفہوم کے مطابق لفظ قوم
کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ہندو ہم سے ہر اعتبار سے آگے بڑھے ہوئے ہیں لیکن
ان میں آج تک وہ ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی جو منتشر افراد کو ایک قومیت کے رشتہ
میں منسلک کرنے کے لئے لاینفک ہے اور جو آپ کو اسلام کی بارگاہ سے بلا مزد و قیمت
بطور عطیہ کے مل گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج ہندو ایک قوم بننے کے لئے بجد
مضطرب اور بے تاب ہے۔ لیکن افراد کو قوم بننے کے لئے ایسے ہی دشوار گزار مراحل
طے کرنے پڑتے ہیں۔ جیسے قطرے کو گوہر بننے کے لئے اور ہندو تو اس وقت تک
ایک قوم بن ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ اپنے تمام موجودہ معاشرتی نظام کو یکسر
بدل نہ ڈالیں۔ نہ ہی مسلمان لیڈروں اور سیاست دانوں کو اس قسم کے عیارانہ اور
گمراہ کن استدلالات کی رو میں بہ جانا چاہیئے کہ ترکی اور ایران اور دیگر ممالک
اسلامیہ کے باشندے قومی یعنی جغرافیائی نظریات کے ماتحت ترقی کرتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات بالکل مختلف ہیں۔ ہندوستان سے باہر کے اسلامی ممالک میں قریب قریب تمام آبادی مسلمانوں کی ہے اور وہاں کی اقلیتیں باصطلاح قرآن کریم "اہل کتاب" پر مشتمل ہیں۔ اور اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان کوئی معاشرتی حد بندی نہیں ہے۔ کوئی یہودی یا عیسائی یا اہل زرتشت اگر مسلمان کے کھانے کو چھو دے تو اس کا کھانا بھرشٹ نہیں ہو جاتا اور اسلامی شریعت میں اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ شادی بھی جائز ہے۔ اسلام نے تمام نوع انسانی میں ایک وحدت پیدا کرنے کے لئے پہلا عملی قدم یہ اٹھایا کہ ان لوگوں کے آگے بڑھنے اور اتحاد پیدا کرنے کی دعوت دی جن کا اخلاقی نصب العین اسلام کے نصب العین سے قریب تر تھا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

اے اہل کتاب آؤ اس حقیقت پر متحد ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلام اور عیسائیت کی جنگوں نیز اہل یورپ کی مختلف النوع چیرہ دستیوں نے اس آیۃ مقدسہ کے لامتناہی مفہوم کو دنیائے اسلام میں عملی جامہ پہننے کا موقع نہ دیا۔ آج اسلامی ممالک میں اس حسین خواب کی تعبیر اس رنگ میں ہو رہی ہے جسے "اسلامی قومیت" کہا جاتا ہے۔

میرے لئے یہ عرض کرنا چنداں ضروری نہیں کہ ہمارے نمائندے جتنے زیادہ اس بات میں کامیاب ہوں گے کہ وہ غیر مسلم نمائندوں کو ہمارے دلی ریزرویشنز کے مطالبات کو تسلیم کرنے پر رضامند کر لیں۔ اتنی ہی ان کی کامیابی زیادہ یقینی

جائے گی۔ اگر یہ مطالبات منظور نہ کیئے گئے تو پھر قوم کے لئے موت اور حیات کا سوال درپیش ہوگا۔ اس وقت مسلمانوں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر متحدہ طور پر کوئی قدم اٹھائیں۔ اگر آپ سچ مچ اپنے مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو اس متحدہ عمل کے لئے ہر وقت آمادہ رہنا چاہیئے۔ اکابر ملت سیاسی معاملات کے متعلق کافی غور و تدبر کر چکے ہیں جس نے ہمارے دلوں میں ان قوتوں کا کم و بیش احساس ضرور پیدا کر دیا ہے جو اس وقت ہندوستان کے اندر اور باہر کی قوموں کی تقدیروں کو سانچے میں ڈھال رہی ہیں۔ لیکن میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انہوں نے ہمیں اس عملی قدم کے لئے بھی تیار کر دیا ہے جس کے لئے مستقبل میں رونما ہونیوالے حالات متقاضی ہونگے میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ دور حاضرہ میں مسلمان دو مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ پہلی مصیبت قحط الرجال کی ہے۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ ارون کی یہ تشخیص بالکل صحیح تھی کہ مسلم قوم میں رہنماؤں کا فقدان ہے جیسا کہ انہوں نے علی گڈھ یونیورسٹی کے طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ لیڈروں سے میری مراد ایسے حضرات ہیں جنہیں مبدا فیض کی کرم گستری یا مشاہدات و تجربات کی بنا پر ایک طرف اسلام کی روح اور اسکے منتہائے نگاہ کے متعلق بصیرت تامہ حاصل ہو اور دوسری طرف عصر حاضرہ کے تاریخی شواہد بھی ان کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہوں۔ ایسے لوگ درحقیقت وہ زندہ قوتیں ہوتے ہیں جو قوم کے عروق مردہ میں خون زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اللہ کی دین ہوتے ہیں جسے چاہے دے۔ حسب فرمائش بنوائے نہیں جا سکتے۔ دوسری مصیبت جو مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہے یہ ہے کہ ان کے دل سے احساس اجتماعیت فنا ہو رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراد اور چھوٹے چھوٹے فرقے

الگ الگ راستوں پر گامزن ہو رہے ہیں اور ان کا کوئی کام ملت کے اجتماعی کردار و اعمال کو کچھ فائدہ نہیں پہونچاتا۔ ہم آج میدان سیاست میں وہی کچھ کر رہے ہیں جو صدیوں تک مذہب کے دائرے میں کرتے رہے ہیں۔ لیکن فرقہ بندی کے فروعی جھگڑے ہماری اجتماعیت کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ ان جھگڑوں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ اصل اصول (مذہب) جو ہماری اجتماعیت کا نقطۂ ماسکہ ہے اس سے ہمیں گہری دلچسپی ہے۔ پھر یہ اصول اپنے اندر اتنی وسعت رکھتا ہے کہ کوئی گروہ یا فرقہ اس حد تک سرکش نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے کٹ جائے۔ لیکن سیاسیات کے دائرے میں انتشار اور بالخصوص ایسے مواقع پر انتشار جب کہ قوم کی زندگی کا انحصار ہی اتحادِ عمل پر ہو۔ قوم کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم ان ہر دو مصیبتوں کا علاج کیا کریں۔ پہلی مصیبت (یعنی صحیح رہنماؤں کا فقدان) کا علاج تو ہمارے بس میں نہیں ہے۔ البتہ دوسری مصیبت (عدم احساس اجتماعیت) میرے خیال میں ناقابلِ علاج نہیں۔ اس باب میں میرے سامنے ایک منظم لائحہ عمل موجود ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب تک وہ مزعومہ خطرہ پیدا نہ ہو جائے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ صورتِ حالات پیدا ہو جائیں تو اس وقت ضرورت ہوگی کہ ہر طبقے اور ہر گروہ کے ممتاز اکابر ملت ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں اس لئے نہیں کہ ریزولیوشن پاس کئے جائیں۔ بلکہ اس لئے کہ مسلمانوں کے لئے آخری طریق کا متعین کیا جائے۔ اور انہیں حصول مقاصد کا عملی راستہ بتایا جائے۔ میں نے اس خطبہ میں اس دوسری شکل کا تذکرہ صرف اس لئے

کر دیا ہے کہ آپ اسے اپنے پیش نظر رکھیں اور اس دوران میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کریں۔

ہندوستان کی غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے

خاتمۂ سخن۔

حضرات! مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔ خاتمہ پر میں اس امر کی اہمیت واضح کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں پر جو نازک وقت آج آچکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدتِ افکار و عمل پیدا کر کے مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ ان کی یہ تنظیم ملتِ اسلامیہ اور ہندوستان دونوں کے حق میں مفید ہو گی۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی ایشیا بھر کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ بنی رہی ہے۔ اور اس وقت بھی وہی کیفیت ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے۔ اور اس سرزمین کو اظہارِ خودی کی اس مسرت سے سرمحروم کر دیا ہے جس کی برکت سے یہ کبھی ایک عظیم الشان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنی تھی۔ جس سرزمین (یعنی ہندوستان) کے ساتھ ہمارا جینا اور مرنا وابستہ ہو چکا ہے۔ اس کی طرف سے ہم پر ایک اہم فریضہ عائد ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہم پر ایشیا کی طرف سے اور علی الخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی

ملت اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس زاویہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا۔ بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالم اسلامی پر کیا اثر ہوگا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہمپر عائد ہوتے ہیں۔ ان سے ہم کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو اور اس کے حصول کے لئے ہم سب منظم طور پر عزم نہ کرلیں۔ ہندوستان کے دیگر سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ملی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم ہوں۔ متحد ہوں۔ ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن کے ساتھ ہماری ملت کی موت اور زندگی وابستہ ہے۔ بہت بُری طرح اثر انداز ہو چکا ہے۔ میں فرقہ وار مسائل میں سمجھوتہ کی طرف سے ناامید نہیں ہوں۔ لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمان کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کرکے ان کا مقابلہ کرنا پڑے اور ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں۔ جو حصول مقاصد کے لئے تلی بیٹھی ہوں اور اپنے تمام عزائم کو ایک مستحکم نصب العین پر مرکوز کئے ہوتے ہوں۔ اچھا! تو کیا اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ مسلمانوں میں اس قسم کی وحدتِ افکار پیدا ہو سکے۔ ہاں! یہ ممکن ہے۔ اس کے لئے طریق عمل یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو پارٹی بازی کے محدود مفاد اور ذاتی اغراض کی سطح سے بلند کرلیں اور اس بلند ترین نصب العین کی روشنی میں جس کی نیابت کے لئے دنیا میں ملت اسلامیہ کا وجود قائم ہے۔ اپنی انفرادی

اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت متعین کریں۔ خواہ وہ اعمال مادی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس مادیت کے کثیف مقاصد سے روحانیت کی لطیف منازل کی طرف گامزن ہو جائے۔ مادہ انتشار کا مظہر ہے اور روح توانائی زندگی اور وحدانیت کی قندیل مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے اور وہ یہ کہ ان کی تاریخ کا نازک ترین ادوار میں مذہب (اسلام) نے ملت کو بچایا ہے نہ کہ ملت نے مذہب کو (یعنی اگر اسلام کی حفاظت کی طرف توجہات مرکوز کروگے تو تم خود بخود محفوظ ہو جاؤ گے اور اگر یہ سمجھو گے کہ مسلم افراد کی حفاظت ہو جائے تو اسلام بھی محفوظ ہو جائے گا تو یہ تمام خیالی ہے) اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو صرف اسلام کے نقطۂ اسکہ پر مرتکز کر دیں۔ اور جو زندہ اور پائندہ قائم و دایم نظریۂ حیات وہ پیش کرتا ہے۔ اس سے اپنی بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشر قوتوں کو پھر سے مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سر نو حاصل کر لیں گے اور یوں اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے مہیب جہنم سے بچا لیں گے۔ قرآن کریم کی ایک مہتم بالشان آیت

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ الآیۃ

میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمام نوع انسانی کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ ایک فرد واحد کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ کے مثل ہوتی ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات جو بہ حیثیت قوم نوع انسان کے متعلق اس بلند ترین تصور کے اولین مظہر ہونے کے جائز مدعی ہو سکتے ہیں۔ باہمی بے تعلقی کو چھوڑ کر ایک جسد واحد کی طرح ایسی زندگی بسر نہ کریں (کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھے تو آنکھ کے آبگینہ میں

آنسو چھلک آتے) جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان میں معاملات جس طرح بظاہر نظر آتے ہیں۔ ان کی حقیقت اس سے کہیں مختلف ہے۔ تو اس سے میں آپ کو کسی حیرانی میں ابھارنا نہیں چاہتا۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم آپ کے افقِ دماغ پر اس وقت نور افشاں ہوگا جس وقت آپ انہیں حقیقی "اجتماعی خودی" کی روشنی میں دیکھنے کا ملکہ حاصل کر لیں گے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں

عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

(اپنی خودی کا استحکام کرو۔ اگر تم خود صحیح راستہ پر گامزن ہو گے تو کوئی غلط راستہ پر چلنے والا تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا)

(ترجمہ اسطلوع اسلام)